Date of Publication: 16-04-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 APRIL 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

# ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 APRIL 2013
۲۲ تا ۲۸ راپریل ۲۰۱۳ء

Issue: 16, Vol.: 72
شمارہ نمبر: ۱۶، جلد نمبر: ۷۲

پہلی قسط

# نکسل وادیوں کے درمیان

لیلا نائیڈو

انگریزی سے ترجمہ: مظفر حسین سید

(2911، سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)

لیلا نائیڈو کو Vogue میگزین نے دنیا کی پانچ خوب صورت ترین خواتین میں ایک قرار دیا تھا، لیکن شاید وہ اس سے بھی کہیں زیادہ حسین تھیں۔ ان کی شخصیت میں جیسی سحر جنتی تھی، وہ کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ رشی کیش مکرجی کی فلم 'انورادھا'، مرچنٹ آئیوری کی فلم 'دی ہاؤس ہولڈر' اور شیام بینیگل کی فلم 'تری کال' [ماضی، حال اور مستقبل] میں ان کے رخِ روشن کا جلوہ اس سے بھی کہیں زیادہ قیامت خیز تھا۔ وہ ایسی خاتون تھیں جنھوں نے چار بار راج کپور کی فلم کا کنٹریکٹ سائن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ Jean Renoir نے انھیں اداکاری کے گُر سکھائے تھے اور Salvodar Dali نے Madona کے لیے ان کی خدمات ماڈل کے طور پر حاصل کی تھیں۔ ابھی وہ بیس برس کی عمر کو بھی نہیں پہنچی تھیں کہ ان کی شادی مشہور اوبرائے خاندان میں ہوگئی جس کی ہوٹل انڈسٹری پر اجارہ داری تھی۔ وہ دو جڑواں بچوں کی ماں بھی بن گئیں مگر اپنے شوہر کی بدمزاجی جو ہذیانی کیفیت کا دوسرا نام تھی، کے سبب یہ شادی دو تین ہی برس میں ٹوٹ گئی۔ بعد میں وہ ہندستان کے انگریزی کے سب سے مقتدر شاعر DOM MORAES کی زندگی میں جمالیات کی ایک دیوی اور ایک وفادار بیوی کے طور پر داخل ہوئیں جو اس کی بلا تنخواہ سکریٹری بھی تھیں اور بہترین دوست بھی۔ اور جب ڈوم موریس نے اپنے گنے چنے سوالوں کے ساتھ اندرا گاندھی کا ان کی سوانح کے لیے انٹرویو کیا تو لیلا نائیڈو نے اس انٹرویو میں ڈوم موریس کے ترجمان کا رول بھی ادا کیا۔ اسی کے ساتھ وہ بہت سے magazines کی اڈیٹر رہیں اور ہانگ کانگ کی ایکشن فلمیں بھی ڈب کرتی رہیں۔ کارشانی کی پہلی پروڈیوسر بھی رہی تھیں۔

LEELA A Patchwork Life، لیلا نائیڈو اور جیری پنٹو کی مشترکہ تالیف ہے۔ لیلا کی تمام زندگی اپنے ارد گرد کی دنیا کو بغیر کسی کوشش کے اپنے وجود کا شدید احساس دلاتے ہوئے گزری۔ جیری پنٹو کا کہنا ہے کہ ہر وہ شخص جو لیلا سے ملا ہے اس کے پاس ایک لیلا نائیڈو کہانی ہے۔ ڈوم موریس کی آوارہ مزاجی کے سبب یہ شادی بھی تادیر قائم نہ رہ سکی اور ڈوم نے سرایو سری وتس کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

لیلا نائیڈو ہندستانی سائنس داں ڈاکٹر رمیا نائیڈو اور ایک فرانسیسی خاتون صحافی کی بیٹی تھیں۔ لیلا نائیڈو اس دنیا میں پلی بڑھی تھیں جو طرح طرح کے لوگوں اور واقعات سے بھری ہوئی تھی۔ رشی کیش مکرجی کی فلم 'انورادھا' سے جس کی نمائش برلن فلم فیسٹول میں ہوئی تھی، لیلا نائیڈو کے فلمی کیریر کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد وہ مرچنٹ آئیوری کی فلم 'دی ہاؤس ہولڈر'، پردیپ کرشن کی فلم 'الیکٹرک مون' اور شیام بینیگل کی فلم 'تری کال' میں جلوہ گر ہوئیں۔ لیلا نے خود اپنی بھی شارٹ فلمیں اور ڈاکومینٹریز بنائیں۔ بالآخر ۲۰۰۹ء میں ان کی بے وقت موت کے ساتھ ان کا یہ حسین سفرِ حیات تمام ہوا۔

یہ دل چسپ باب ان کی جیری پنٹو کے ساتھ لکھی گئی مذکورہ سوانح سے اخذ کیا گیا ہے جس کا ترجمہ 'اردو ادب' کے لیے جناب مظفر حسین سید نے کیا تھا اور یہ ترجمہ ہم 'اردو ادب' کے شکریے کے ساتھ قارئین 'ہماری زبان' کی نذر کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

یہ خیال اگرچہ بہت خوب تھا مگر صرف کاغذ پر۔ ڈوم موریس، ایک نوجوان شاعر جسے مقتدر Hawthornden ادبی انعام ملا تھا، اپنے آبائی شہر لوٹے گا اور بی بی سی کی ایک ٹیم اپنے کیمرے کے ساتھ بمبئی میں اس کا تعاقب کرے گی، جسے 'ایک اجنبی کی واپسی' کا نام دیا جائے گا۔ تعاقب کے اس عمل میں ڈوم کے تمام تر ردِ عمل، اس کی حرکات و سکنات نیز دیگر سرگرمیوں کو فلم بند کیا جائے گا۔ اس پروگرام کا پروڈیوسر بی بی سی کے بے حد سینئر پروڈیوسرز میں سے ایک Tony de lotbiniere کو ہونا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ 'The Bewildered Giant' نام کی ایک فلم کی شوٹنگ بھی کرنا چاہتے تھے۔ ایک ایسی فلم جس کے ذریعے 1969 کے ہندستان کے بارے میں بی بی سی کے زاویے کی نمائندگی ہو سکے۔

بمبئی کی سڑکوں پر سیر و گشت کے دوران ٹونی نے ان خیالات کی وضاحت ڈوم سے کی جو دراصل بی بی سی کا منصوبہ تھا، جس میں یہ ترغیب بھی شامل تھی کہ اس طرح آپ اپنے بچپن کے دوستوں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس غیر متوقع تجویز سے ڈوم مذبذب ہو گیا ہوگا۔

"تمھارے بچپن کے دوست اس شہر میں ضرور ہوں گے۔" میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ ٹونی کی اس تجویز کا جس کے متعلق جواب کی توقع وہ اس لیے نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ کوئی متحمل مزاج شخص نہیں تھا جب کہ مثبت جواب کا کوئی امکان سرے سے تھا ہی نہیں۔ ان دنوں وہ کیرالہ چھاپ بُشرٹ کچھ اس طرح پہنتا تھا جیسے کوئی بُشرٹ خود عمل انجام دے رہا ہو اور وہ بھی بددلی سے۔ لیکن جب اس سے بھی کام نہیں چلا تو جیسا کہ ڈوم نے مجھے بتایا کہ ایک دن ٹونی نے غیض میں سیدھے ڈوم کی کمر پر ایک عدد لات اس لیے رسید کر دی، کیوں کہ گویا میں رنگیلی زمین پر ایک معرکہ کشی کے دوران ڈوم ٹونی کی ہدایت کے مطابق اس تیزی کے ساتھ زمین سے نہیں اٹھ سکا تھا، جو ٹونی کے نشاط کی ضرورت تھی۔

بعد میں ڈوم نے مجھے یہ بتایا کہ ان کی کار لیڈو ہاؤس کے سامنے سے گزر رہی تھی اور سڑک کے اس پار میری ایک قد آدم تصویر والا پوسٹر لگا ہوا تھا۔

"میں اس لڑکی کو جانتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے ایک سکون بھری سانس لی تھی۔

یہ درست ہے کہ وہ مجھے جانتا تھا۔ میرے والد ڈاکٹر نائیڈو اور ڈوم کے والد فرینک موریس اچھے دوست تھے۔ ہم دونوں اس وقت سے ایک دوسرے سے واقف تھے جب میں محض دو برس کی تھی اور ڈوم چار برس کا۔ وہ ایک خاموش طبع اور اپنے اندر جینے والا بچہ تھا۔ تاہم ہم دونوں کی آپس میں خوب پٹتی تھی۔

مجھے ایک واقعہ آج بھی یاد ہے۔ میرا چوتھا جنم دن تھا۔ میں نے ڈوم کو مدعو کیا، کیوں کہ ساتھ کے بچوں میں وہی میرا اکلوتا دوست تھا۔ اس کی والدہ آنٹی بیرل نے مجھے بتایا کہ ڈوم میری برتھ ڈے پارٹی میں شریک نہیں ہوگا۔ لیکن وہ چاکلیٹ کیک کے ساتھ میرا جنم دن اگلے روز اپنے گھر میں منائے گا۔ چنانچہ اگلے دن میں ایک چاکلیٹ کیک لے کر اس کے گھر گئی۔ ڈوم نے کیک کھایا اور مطالعے میں غرق ہو گیا۔

"مجھ سے کچھ بات کرو" میں نے گفتگو کی پہل کرتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے کمرے میں ایک گراموفون رکھا رہتا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ میوزیکل چیئرز کا کھیل کھیلا جائے۔

ڈوم نے ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور بولا، "اگر تم ہار گئیں تو تمھیں اس کا جرمانہ بھرنا پڑے گا۔"

ظاہر ہے کہ میں ہارنے کے لیے

تیار نہیں تھی۔

درحقیقت ڈوم جسٹ کے اعتبار سے ایک کمزور بچہ تھا۔ جب کہ میں تندرست و توانا تھی۔ میں رقص کرتی تھی۔ گھوڑ سواری کرتی تھی اور کئی طرح کے کھیل بھی کھیلتی تھی۔ جب کہ ڈوم اپنا تمام تر وقت کتب بینی میں ہی صرف کرتا تھا، اس لیے، میں نے اس کی شرط مان لی کہ جو ہارے گا وہ جرمانہ بھرے گا۔

اور جب ڈوم ہار گیا تو میں نے حکم صادر کیا کہ وہ اپنی تمام تر کتابیں، بہ یک وقت اپنے سر پر لاد کر چلے گا اور اس کے بعد میں کچھ کھانے کی فرمائش بھی کروں گی۔

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ڈوم اپنی ڈھیر ساری کتابیں سر پر لاد کر گرتے پڑتے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

---

اب ڈوم واپس آ رہا تھا۔ دراصل اس دوران ہماری دوستی ٹھیک ٹھاک نہیں چل رہی تھی۔ اس سے قبل 1959 میں جب وہ اپنی خود نوشت سوانح کی پہلی جلد "Gone Away" مکمل کرنے کے لیے ہندستان آیا تھا تو اس نے مجھے فون پر اطلاع دی۔

"میں ڈوم بول رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ڈوم! یہ تمھاری آواز کو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا تھا۔

"میری آواز کو تو کچھ نہیں ہوا۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

"نہیں، مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تمھارے منہ میں گرم گرم آلو ہے۔" میں نے کہا تھا۔

اس کے بعد ایک لمحہ کا سکوت رہا تھا۔ پھر اس نے میرے سخت جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں چاہتا ہوں کہ ہندستانی فلمی صنعت کے بارے میں تحقیقی کام میں تم میری مدد کرو۔"

کاش! مجھے اس کی مدد کر کے قلبی مسرت حاصل ہوتی مگر یہ اس لیے ممکن نہیں تھا، کیوں کہ اس وقت میں خود اپنی ایک فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھی۔

ان دنوں ہم لوگ کرائے کے ایک محل نما مکان میں باندرہ میں رہائش پذیر تھے۔ میں اپنی والدہ اور ایک ملازمہ کے ساتھ نچلی منزل پر رہتی تھی۔ ہاں! ہمارے گھر میں ایک مرغی بھی پلی ہوئی تھی، جو میری والدہ سے بہت ہلی ہوئی تھی۔ مجھے وقت پر موہن اسٹوڈیو پہنچنے کے لیے صبح پانچ بجے اٹھنا پڑتا تھا لیکن تم

طریقہ یہ تھی کہ میں تو سیٹ پر پہنچ جاتی تھی مگر شاٹ تیار نہیں ہوتا تھا اور میرے دن کا بیش تر حصہ انتظار میں ہی بیت جاتا تھا۔ دراصل میری پابندیِ وقت کی عادت، ہندستانی فلمی صنعت کے مروجہ ماحول سے یکسر مختلف تھی۔

پوری دنیا میں یہ اصول کارفرما ہے کہ اگر شوٹنگ دیر سے شروع ہوگی تو ختم بھی دیر ہی سے ہوگی۔ اس صورت حال میں اگر میں رات کو آٹھ بجے بھی واپس گھر پہنچ جاتی تو غنیمت تھا۔ اس وقت تک میری جان نکل چکی ہوتی تھی اور میرے اندر جلدی جلدی کھانا کھا کر بستر پر دراز ہو جانے کے علاوہ کچھ بھی کرنے کی نہ ہمت ہوتی نہ طاقت۔

میرے صاف انکار سے اس وقت ڈوم بہت جز بز ہوا تھا۔ مگر اب میں ہی اس کی ایک ایسی دوست تھی، جس پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ صرف تنہا میں ہی تھی، جس کے پاس ڈوم کے اس شہر کی یادیں محفوظ تھیں، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت میرے پاس اس کے لیے کچھ وقت نکالنے کی سہولت تھی۔

---

نوّی نے اس سے میرے بارے میں اور پوچھا، تو جتنا اس نے ڈوم سے میرے بارے میں سنا، اتنا ہی مجھ سے ملنے کے لیے نوّی کا اشتیاق بڑھتا گیا۔

"تم نسلاً ہندستانی ہو، پھر بھی سانولے انگریز لگتے ہو اور وہ نصف ہندستانی اور نصف فرانسیسی ہے۔" نوّی نے غالباً اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ کیمرے کے سامنے مجھ سے نوّی کا پہلا سوال یہی تھا۔ "آپ یہاں خود کو کس زمرے میں رکھتی ہیں؟"

یہ باتیں برسوں پہلے کی ہیں، جب شناخت کی سیاست اہم مسئلہ نہیں تھی اور نہ وابستگی کا تصور اس قدر عام ہوا تھا۔ میرے خیال میں جلا وطنوں اور پناہ گزینوں کو یہ خیال ہمیشہ سے ستاتا رہا ہوگا کہ کسی جگہ سے تعلق اور وابستگی کی اہمیت کیا ہے؟ لیکن ان دنوں پوری دنیا میں زیادہ تر لوگوں کو ان امور کی بابت عام طور پر کوئی تشویش لاحق نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے اپنی فہم و فراست کے حساب سے بہترین ممکن جواب پیش کر دیا۔

"میں دو کشتیوں میں سوار ہوں، لیکن میں گرتی ہوں نہیں، کیوں کہ میں یورپی مزاج سے بخوبی واقف ہوں اور ہندستان میرا گھر ہے۔ میں اپنی جڑیں (یورپ یا ہندستان میں) کہیں بھی پیدا کر سکتی ہوں۔"

"میں بھی۔" ڈوم نے یہ دو الفاظ ادا کیے اور زبان پر تالا لگا لیا۔

نوّی ہماری گفتگو سن کر تھوڑے سے الجھ گئے تھے۔ اس گفتگو کی (کیمرے کے سامنے) کنجی یہ ہونی چاہیے تھی کہ ڈوم اس پیچیدہ سوال کے مختلف زاویوں کو زیر بحث لائے کہ اس کے لیے گورے مگر ہندستانی نژاد ہوتے ہوئے انگلینڈ میں رہنا کس ذہنی کیفیت کا غماز ہے۔

"اس سے تمھاری مراد کیا ہے؟" نوّی نے پوچھا۔

"میں لیلا سے اتفاق کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

نوّی اپنے دانتوں کے بیچ ہونٹ چباتے رہے، مگر ڈوم سے کچھ اور نہیں اگلوا سکے۔ درحقیقت ڈوم ایسا ہی تھا۔ اسے اگر اپنے بارے میں کوئی انکشاف کرنا پڑتا تو یہ عمل اس کے لیے خاصا تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا۔ وہ اپنی بات کو ضبط تحریر میں لا سکتا تھا۔ اسے اپنی شاعری میں سمو سکتا تھا، لیکن اپنے بارے میں زبان سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

بہرحال وہ فلم اس کے لیے اس کے تصور سے زیادہ کٹھن ثابت ہونے والی تھی۔ لیکن یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔

ایک واقعہ اور، مجھے اپنے بچوں سے ملنے کے لیے دہلی جانا تھا۔ اس لیے میں نے فریک کو فون کیا، کیوں کہ اگر میں انھیں مطلع نہ کرتی تو انھیں اچھا نہ لگتا۔

"ڈوم وہیں ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ تم سے مل لے۔" انھوں نے مجھے بتایا۔

میرا قیام انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں تھا۔ وہ وہیں مجھ سے ملنے آیا اور اپنا شرمیلا مگر یوں کہیے کہ خیالات بھرا چہرہ لیے دبا دبا سا بیٹھا رہا۔ میں نے اسے چائے پیش کی اور دل ہی دل میں طے کیا کہ میں اس کے اوپر کوئی طنزیہ جملہ نہیں کسوں گی۔

"میرے پاس موزوں ملبوسات نہیں ہیں۔" اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ایک سیاہ اور ایک کتھئی جوتے کے صرف دو جوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ تین قمیص ضرور ہیں مگر کسی میں بھی بٹن نہیں ہیں اور میرا ٹوئیڈ کا کوٹ میری پتلون سے میل نہیں کھاتا۔"

"میں تمھارے لیے خریداری کر دوں گی۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرے پاس محض بیس پاؤنڈ ہیں۔" اس نے کہا۔

"اس کی پروا نہ کرو۔ یہ تمام چیزیں تمھارے لیے میں خریدوں گی، کیوں کہ تم میرے دوست ہو۔ میرے پیسے تم بعد میں لوٹا سکتے ہو۔"

"میں خریداری کی بات نہیں کر رہا ہوں... کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"ہاں، ضرور۔" میں نے کہہ تو دیا، مگر مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ اس سلسلے میں جب اس نے فریک کو بتایا تو وہ خوشی کے مارے رونے لگے۔ کم از کم ڈوم نے بعد میں مجھے یہی بتایا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں مجھے تمھارے والد سے بات کرنی ہوگی۔"

دراصل ایک پکے برطانوی کی طرح اس کا نظریہ تھا کہ سب کچھ درست رکھا جائے۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نہ صرف یہ کہ ایک آوارہ مزاج شخص جو دنیا کے رائج طریقوں میں بالکل یقین نہیں رکھتا، بلکہ اس کا "سوہو" (Soho) ماضی بھی ہو، کیا وہ اتنا دقیانوسی ہو سکتا ہے۔

بعد میں ایک شام، میرے والد نے تنہا شطرنج کھیلتے وقت اس سلسلے میں مجھ سے بات کی۔ میں شطرنج کھیلنا جانتی تھی، انھوں نے خود مجھے یہ کھیل سکھایا تھا۔ تاہم وہ مجھے اپنے مقابلے میں کھیلنے کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

"تم کبھی جارح نہیں ہوتیں۔" انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ "محض اپنا دفاع کرتی ہو۔"

یہ شاید میرے بارے میں ایک طرح کی پیشین گوئی تھی۔

اپنا اگلا نشانہ تانتے ہوئے انھوں نے مجھے بتایا کہ ڈوم انھیں تاج محل ہوٹل کے ہاربر (Harbour) بار میں لے گیا تھا اور وہاں اس نے ان سے بات کی تھی۔

"دراصل اس نے مجھ سے تمھارا ہاتھ مانگا اور شادی کی تجویز رکھی۔" انھوں نے مجھے بتایا۔

"تو یہی کہنے کی بات تھی؟" میں نے تبصرہ کیا۔

"ہاں، لیکن میرے خیال میں اسے اپنی بات کہتے وقت ذرا محبت بھرے الفاظ استعمال کرنا چاہیے تھے۔" یہ جملہ انھوں نے ایک میرے سفید مہرے کو پیٹتے ہوئے ادا کیا تھا۔

"تب آپ نے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اس سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں کسی بہکانے والے شخص کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا۔" اور یہ جملہ بھی انھوں نے ایک سیاہ مہرہ پیٹتے ہوئے ادا کیا تھا۔

"ڈیڈی!"

"بالکل، میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"ڈیڈی!" میں نے پھر احتجاج کیا۔

"بھئی، میں نے کہا نا کہ یہ تمھاری زندگی کا سوال ہے اور ہم نے ہمیشہ تمھیں اپنے فیصلے خود کرنے کی چھوٹ دی ہے۔"

یہ درست تھا۔

"میں کہتا ہوں کہ اگر تم ایک مجہول شخص سے شادی کرنا چاہتی ہو تو مجھے اس سے کیا سروکار۔"

"وہ ہمیشہ سے کاہل الوجود اور بد وضع رہا ہے۔" میں نے بڑے ہی ارفع و اعلا انداز میں یہ بات کہی۔ "دراصل یہ تخلیقی حیات کا مسئلہ ہے۔"

میں محسوس کر رہی تھی کہ میرے والد کی نگاہیں مجھ پر ہی مرکوز ہیں۔ دراصل انھیں کسی بھی شخص کو پسپا کرنے میں ملکہ حاصل تھا، وہ کسی کی بھی شیخی اور تکبر کو چور چور کر سکتے تھے۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ خود وہ بھی تو ڈوم کی طرح خیالوں کی دنیا کے باشندے تھے مگر مجہول، کاہل الوجود یا بد وضع کبھی نہیں رہے تھے۔ ان میں کوئی تصنع، کوئی چمک بھی نہیں تھی، لیکن وہ خستہ حال ہرگز نہیں تھے۔

"مجہول وہی شخص ہوتا ہے جو دانستہ اس کیفیت کو اختیار کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تنک مزاجی بہرحال اچھی چیز ہے۔" انھوں نے یہ جملہ خود کو بساط پر ہر طرف سے محصور ہوتے دیکھ کر ادا کیا تھا۔ "تاہم جن کا دفاع ممکن ہی نہیں، ان کا دفاع ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔"

---

بی بی سی کی ٹیم، جس کے ساتھ ڈوم کام کر رہا تھا، وہ کلکتے کے لیے روانہ ہوگئی۔ انھیں وہاں اپنی فلم کے کچھ حصے چند فلسطینیوں کے ساتھ فلم بند کرنے تھے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ڈوم نے مجھے فون کیا۔

"تم یہاں آ کر ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔" اس نے بڑے ہی دوستانہ اور بااخلاق لہجے میں کہا تھا۔

مجھے اس وقت کسی خطرے کی بو، کسی بڑے خطرے کا احساس کر لینا چاہیے تھا۔

وہاں ڈوم ایک اچھی خاصی جماعت کے ساتھ موجود تھا۔ سارے شرابی کبابی اکٹھے تھے اور اس دوران اچانک اسے اپنی منگیتر کا خیال آ گیا تھا۔ لیلا کا۔

(باقی آئندہ)

# محمود زکیؔ کی شاعری میں
# قومی یک جہتی اور حبُّ الوطنی کے عناصر

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ شکیل (صدر شعبۂ اردو، سیوا سدن کالج، برہان پور، ایم۔ پی)

مدھیہ پردیش کا شہر اُجین جہاں اپنی قدیم تاریخی اہمیت کے لیے مشہور ہے تو وہیں علم و ادب کا گہوارہ بھی ہے۔ نیز زمانہ قدیم سے ہی تعلیمی اعتبار سے اہمیت کا حامل بھی رہا۔ کرشن جی اور سداما نے یہاں کے سندیپن آشرم میں تعلیم حاصل کی۔ مہاکوی کالیداس اور بھرتری نے اس شہر کو عروج بخشا۔

اسی سرسبز و شاداب زمین پر سید پیر علی صاحب کے گھر ۲۳ دسمبر ۱۹۲۳ء کو محمود زکی نے آنکھیں کھولیں۔ زمانہ طفلی میں ہی والد کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ آپ کو شعر و ادب سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ اس پر اُجین کی ادبی فضا کا کیا کہنا جس نے انھیں اپنے حصار میں لے لیا اور مکمل شاعر بنا دیا۔ محمود زکی بیک وقت شاعر، ادیب، نثر نگار، مترجم، صحافی اور نقاد تھے۔ فن شاعری میں آپ نے باقاعدہ کسی کے سامنے زانوے ادب تہہ نہیں کیا بلکہ اپنے فطری رجحان، ناقدانہ نظر کے ساتھ مشق و مہارت کے ذریعے وہ مقام حاصل کیا کہ ان کا کلام استادانہ شان کا حامل ہو گیا۔ آپ کے تین مجموعہ ہائے کلام 'اعتبار'، 'نقوش' اور 'ہم شاعر دیوانے ٹھہرے' منظر عام پر آکر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ویسے تو وہ غزل کے شاعر تھے مگر انھوں نے نظمیں بھی خوب کہیں۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، سنا، محسوس کیا اسے شعری پیکر عطا کیا۔ ان کی شاعری میں عوام کو اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اشعار دل سے نکلتے ہیں اس کا براہ راست دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک پہلو قومی یک جہتی اور حب الوطنی بھی ہے۔ ہر شاعر کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے اور اس کی حب الوطنی کسی نہ کسی روپ میں اس کی شاعری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ محمود زکی کا بیشتر کلام قومی یک جہتی، وطن دوستی اور حب الوطنی سے سرشار ہے۔ ہمالہ کی عظمت اور کشمیر کی خوب صورتی کو وہ اپنے اشعار میں یوں اجاگر کرتے ہیں:

فخر کرتا ہے جس پر یہ ہندوستاں
جس کی عظمت کا قائل ہے سارا جہاں
چومتا ہے جسے جھک کے خود آسماں
وہ ہمالہ ہیں جس کے ہم پاسباں

حسنِ فطرت کی رنگین تصویر ہے
زندگی بخش خوابوں کی تعبیر ہے
اب وہ خطہ جو بھارت کی تقدیر ہے
نام جس کا زمانے میں کشمیر ہے

محمود زکی قوم و ملک کے نوجوانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے یوں نصیحت کرتے ہیں:

اے مسلم خوابیدہ اٹھ وقت سحر بھی ہے
جاگی ہے کہاں دنیا کچھ اس کی خبر بھی ہے
رہزن و رہبر سب ہیں تاک میں تیری
لٹ جانے کا اندیشہ کچھ جانے کا ڈر بھی ہے

زکی صاحب اپنے اشعار کے ذریعے قوم میں اعلا جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں:

خوش نصیبوں کے دل کا قرار بن کے اٹھو
بہار ہی نہیں جانِ بہار بن کے اٹھو
رہو تو ایسے کہ جانِ بہار کہلاؤ
اٹھو تو سارے چمن کا وقار بن کے اٹھو

ہندوستان ایک ایسا پھولوں کا گلدستہ ہے جس میں مختلف قسم، رنگ اور خوشبو کے خوب صورت پھول شامل ہیں، ان میں اگر ایک بھی پھول مرجھا جائے تو اس کی خوب صورتی کم ہو جائے گی۔ محمود زکی ان پھولوں کو جو کہ مختلف قوم، نسل، رنگ اور مذاہب کے ہیں، شاداب دیکھنا چاہتے تھے، وہ ان میں وحدت اور یک جہتی چاہتے تھے تاکہ اتحاد قومی پیدا ہو سکے، فرماتے ہیں:

اتحاد، غبارِ دل ہٹ جائے گا جس دن زکی
گلستاں کہنے کے قابل گلستاں ہو جائیں گے

محمود زکی وطن سے غداری کو سب سے بڑا جرم تسلیم کرتے ہیں اور ایسے غدار اور لالچی لوگوں سے بچنے کی تلقین یوں کرتے ہیں:

اب بھی کچھ پھول وطن کی دھرتی پہ کھل جاتے ہیں
تھوڑے سے لالچ کی خاطر غیروں سے مل جاتے ہیں
جن کی سازش کے شعلوں سے دل اپنے جل جاتے ہیں
ان خطروں سے بچنے کو آؤ پھر سے جٹ جائیں
ایسا نہ ہو ان چوروں کے ہاتھوں پھر سے لٹ جائیں

محمود زکی وطن کی محبت میں رنگ و نسل کی دیواروں کو توڑ کر بلند جذبے سے سرشار ہو کر اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

نظر بلند اگر ہو تو پھر نہیں رہتے
یہ رنگ و نسل کے جھگڑے یہ فرق خوب و ذلیل

محمود زکی ہندوستانی عوام کے مسائل و مصائب سے خوب واقف رہے۔ انھوں نے معاشرے کی بدحالی کا ذمہ دار سیاست دانوں اور حکمرانوں کو ٹھہرایا اور اسی لیے ان پر خوب طنز بھی کیا:

رہزن بھی تو رہبر بن کر اپنی جھولی بھرتے ہیں
ایسے لیڈر سستی شہرت پانے کو بھی مرتے ہیں
جھوٹی خوش فہمی کے جب یہ اظہار میں کرتے ہیں
وطن کا نقشہ بدلے گا کیا کاغذی تصویروں سے
بنتا کب ہے بگڑا ہے بن خالی تحریروں سے

جب دشمن سے جنگ کے موقع پر اندرا گاندھی نے قوم کے سپاہیوں سے تعاون کی اپیل کی تھی تب آپ نے بھی ایک نظم 'آج خطرے میں ہے' لکھی، جس میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نوجوانو! ہو تم وطن کی آبرو
توڑ دو جام کر پھینک دو یہ سبو
سرحد مانگتی ہیں تمہارا لہو
جان دے کر وطن پر ہو سرخرو
موت تو آئے گی یوں مرو کہ نہیں
تم کو احساس اس کا ہوا کہ نہیں
آج خطرے میں ہے امن کی سرزمیں

محمود زکی کو اس بات کا گلہ ہے کہ جس آزادی کا خواب دیکھا گیا، جس آزادی کے لیے ہزاروں محبانِ وطن نے ہنستے ہنستے اپنی جانیں قربان کر دیں وہ اصل آزادی نہیں ملی، فرماتے ہیں:

وطن میں اپنے ہیں کچھ اندھیرے اب بھی
جہل و افلاس کے سائے ہیں گھنیرے اب بھی
وطن آزاد ہوئے کتنے برس بیت گئے
تشنہ ساحلوں کو لٹتے ہیں سویرے اب بھی

باوجود اس کے وہ حوصلہ نہیں ہارتے اور عزم کے ساتھ کہتے ہیں:

میرا ایمان ہے اک دن محبت ہی سے حل ہوں گے
نہیں کوئی بھی حل آج، جن الجھے مسائل کا

کہ غلام سے ہاشتنی حقیقت ہے
اک انقلاب کی دنیا کو پھر ضرورت ہے

آزادی کے بعد کا ماحول بے حد بھیانک اور کرب ناک تھا۔ تقسیم وطن نے دو بھائیوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا کر دیا تھا، جس کا شدید درد و احساس محمود زکی کو بھی تھا۔ فرماتے ہیں:

رت بدلی، موسم بدلا، بادل برسے کیا بات ہوئی
تو کے سامنے رشتے ناتے لوگ بٹے اجالے ہی

بستی بستی پھیلی ہے نفرت کی آگ
دل سے تھا دل کا جو رشتہ بھول گیا

محمود زکی کی نظموں میں ایک دردمند وطن پرست اور انسانیت پرست شاعر کے جذبات و احساسات کا وہ راست انداز ہے جو دل سے نکل کر دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں جن میں پندرہ اگست، لوٹ آؤ محبوب جواہر، نیا گیت، اذانِ سحر، آج خطرے میں ہے، وقت کی آواز، اے وطن، میں تو چاہوں لاکھ مگر، حب الوطنی سے سرشار ہیں جو ان کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

تم کو خبر ہے آئیں اپنا دیس پہ طوفانوں کے حلقے
سرمایہ کے ساتھی دیکھو یہاں کے بھیس میں آئے
غداروں اور مکاروں کو تم بھی تو پہچان نہ پائے
پھر تم کہاں جواہر تم کو یہ احساس دلانے
بنا کی آہوں تک پہنچیں، بچا کر ان شعلوں سے
لوٹ آؤ محبوب جواہر اب تو بچے اپنوں سے

ان تمام حقائق کی روشنی میں محمود زکی کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک وطن پرست شاعر اور قومی یکجہتی کے علمبردار کی تو ہے ہی ساتھ ہی ایک عظیم انسان کی بھی ہے جس کی ضرورت انسانیت کو تا قیامت رہے گی۔

●●●

## مشاہیر کے خطوط

انجمن ترقی اردو (ہند) کے آرکائیوز میں بڑی تعداد میں اکابرین کے خطوط محفوظ ہیں، لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ ادھر کچھ برسوں سے اکابرین کی تخصیص کے بغیر ہی ہمارے پاس خطوط آ رہے ہیں اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ اب آرکائیوز میں صرف مشاہیر اور اکابرین کے ہی خطوط محفوظ کیے جائیں گے۔ لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ خطوط ارسال کرنے سے پہلے دیکھ لیں کہ مذکورہ خطوط اکابرین کے خطوط کے زمرے میں آتے ہیں کہ نہیں، ورنہ ایسے خطوط کا محفوظ کرنا ہمارے لیے مشکل ہے اور ایسے خطوط ضائع کر دیے جائیں گے۔ (ادارہ)

# اردو دُنیا

## یو.پی میں اردو ٹیچروں کی تقرری کا راستہ صاف
## تین ہزار اساتذہ کی تقرری کی تجویز منظور

لکھنؤ (۱۳ اپریل)۔ اترپردیش کے وزیر اعلا اکھلیش سنگھ یادو کی صدارت میں آج یہاں ریاستی کابینہ کی میٹنگ ہوئی جس میں ایک اہم فیصلہ کرتے ہوئے حکومت نے بغیر ٹی ای ٹی کے اردو اساتذہ کی تقرری کے نظام کو منظوری دے دی۔ کابینہ کے اس فیصلے سے اردو ٹیچروں کی تقرری کا راستہ صاف ہو گیا ہے اور کابینہ نے اس کے ساتھ ہی تین ہزار اردو ٹیچروں کی تقرری کی تجویز کو بھی منظور کر لیا ہے۔ کابینہ نے اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے ٹی ای ٹی کی لازمیت کو ختم کر کے امتحان کے نئے فارمولے کی تجویز کو بھی منظوری دے دی جس کے تحت اب ریاست میں اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے منظور شدہ نئے فارمولے کے تحت امتحان کرایا جائے گا۔ کابینہ نے جس نئے فارمولے کو منظوری دی ہے اس کے تحت ٹی ای ٹی کی طرز پر اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے علاحدہ امتحان کرایا جائے گا جو 150 نمبروں کا ہوگا اور اس میں زبان کے ساتھ ہی جنرل نالج اور اردو سے متعلق سوالات ہوں گے لیکن ریاضی اور انگریزی کے سوالات نہیں ہوں گے۔ امتحان میں شریک ہونے والوں کو پاس ہونے کے لیے کم از کم 60 نمبر حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ واضح رہے کہ اترپردیش میں گزشتہ کئی برسوں سے ٹی ای ٹی کے سبب اردو اساتذہ کی تقرری التوا میں پڑی ہوئی تھی کیوں کہ پرائمری اسکولوں میں ٹیچروں کی تقرری کے لیے ٹی ای ٹی پاس کرنے کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ اترپردیش کے مختلف اسکولوں میں اردو اساتذہ کے 2911 عہدے خالی ہیں اور حکومت مذکورہ عہدوں پر معلم اردو سند یافتگان اور اے ایم یو سے ڈپلوما کرنے والے امیدواروں کی تقرری کرنا چاہتی ہے اس کے لیے ۱۱ اگست ۱۹۹۷ء سے پہلے کے معلمین اردو ہی مجاز ہوں گے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## اردو مترجمین کی تقرری جلد

مظفرنگر (۱۱ اپریل)۔ ضلع میں خالی پڑے اردو مترجمین کے عہدوں پر تقرری کے لیے آئندہ تین دنوں کے اندر اشتہار شائع کر دیا جائے گا۔ یہاں اردو مترجمین کی ۱۱ اسامیاں خالی پڑی ہیں، ساتھ ہی نئے ضلع شاملی میں 33 عہدے خالی ہیں۔ دونوں اضلاع کے الگ الگ اشتہارات نکالے جائیں گے۔ ضلع کے 5 محکمے ایسے تھے جہاں ۱۹۹۳ء میں اردو مترجمین کی تقرری تو ہوئی تھی مگر یہاں سے تقرری کے آرڈر نہیں دیے گئے تھے۔ ایسے ڈپارٹمنٹل افسران کی بھی میٹنگ بلائی گئی ہے۔ انتظامی افسر دھرم ویر سنگھ نے پانچوں محکموں کے افسروں سے اس بارے میں معلومات طلب کی ہیں کہ آخر اس وقت تقرری لیٹر کیوں جاری نہیں کیے گئے تھے۔ واضح رہے کہ میرٹھ، بجنور اور باغپت میں اردو مترجمین کی تقرری کی خوشخبری کی جا چکی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## ہگلی کے اسکول سے اردو کی درس و تدریس کو ختم کرنے کی سازش

ہگلی، مغربی بنگال (۳۰ مارچ)۔ گورہری ہرگنج ودیا مندر ہگلی ضلع کا مشہور و معروف اردو ہندی میڈیم اسکول ہے جس کی بنیاد ۱۹۷۱ء میں مہاتما گاندھی کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ گزشتہ کئی دہوں سے یہاں ہندی کے ساتھ اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات بھی تعلیم حاصل کرتے آئے ہیں۔ اردو میں درس و تدریس کے لیے دو ٹیچر اپنی خدمات انجام دیتے رہے ہیں جو گزشتہ سال اپنی سروس سے ریٹائر ہو گئے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا ایک سنگھ پر ایک متعصب ذہنیت کے شخص ہونے کا الزام ہے جنھیں اردو نام سے ہی چڑ ہے۔ اردو اساتذہ کرام کی عدم دستیابی کا بہانہ بنا کر وہ اس سال سے اردو طلبہ و طالبات کا داخلہ نہ لینے کا اعلان کر چکے ہیں، جب کہ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اس اسکول کا ذکر لسٹ آف ہائر سکنڈری اسکولس میں اردو-ہندی میڈیم اسکول کے طور پر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اردو درس و تدریس کو بند کرنا اپنے آپ میں ایک غیر قانونی عمل ہوگا۔

ہگلی ضلع میں مذکورہ بالا اسکول واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں سے اردو طلبہ و طالبات کامرس میں ایچ ایس کر سکتے ہیں۔ اب غریب اردو والوں کی بدقسمتی ہی کہیں کہ اس اسکول میں بھی اُن کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مغربی بنگال میں سیاسی تبدیلی کے بعد جب اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو اردو داں طبقہ خوش ہو گیا کہ اب ہر سرکاری دفتر میں اردو والوں کی بحالی ہوگی لیکن ہگلی ضلع کی اردو آبادی کو اس وقت مایوسی ہوئی جب ضلع کے مشہور و معروف تعلیمی ادارے سے اردو کی درس و تدریس کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس خبر سے اسکول سے متصل اردو آبادی علاقہ بانسبیڑیا، چندن نگر، تیلنی پاڑہ، چاپدانی، بھدریشور، گوری پور اور کانکی نارہ جیسے علاقوں میں غم و غصہ پایا جا رہا ہے۔ بانسبیڑیا میں یوتھ کانگریس کے لیڈر محمد پرویز جیلانی کی زیر صدارت ایک احتجاجی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں گورہری ہرگنج ودیا مندر میں اردو کی درس و تدریس کی از سر نو شروعات کے مختلف طریقۂ کار پر غور و فکر کیا گیا۔ میٹنگ میں علاقے کے بااثر اشخاص ایڈووکیٹ رحیم علی، ماسٹر جاوید اکرم انصاری، ماسٹر محمد منصور، شمس الدین، اشرف علی، آفتاب عالم، محمد تحسین صاحب، سابق کونسلر صابر حسین اور محمد پرویز کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی اور مذکورہ بالا ادارے میں دوبارہ اردو کی درس و تدریس کے نظم کا مطالبہ کیا۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)



## جھارکھنڈ میں جلد ہی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آئے گا

رانچی (۱۳ مارچ)۔ جھارکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر سید احمد نے یقین دہانی کرائی ہے کہ ملک کی دیگر ریاستوں کی طرح جھارکھنڈ میں بھی جلد ہی اردو اکادمی قائم کر دی جائے گی، جس میں شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کو شامل کیا جائے گا۔ اردو اکادمی میں اردو داں طبقے کے نامور افراد کو شامل کیا جائے گا تاکہ ریاست میں اردو کو اس کا صحیح مقام حاصل ہو۔

گورنر نے کہا کہ گزشتہ دنوں اردو اکادمی کے سلسلے میں اعلا حکام کی میٹنگ طلب کی گئی تھی، اس میٹنگ میں افسروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ملک کی دوسری ریاستوں کے طرز پر جھارکھنڈ میں بھی اردو اکادمی قائم کرنے کا لائحۂ عمل تیار کریں اور اس کے بجٹ کی بھی نشاندہی کریں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی مختلف ریاستوں سے اردو اکادمیوں کے اصول و ضوابط اور دیگر معلومات حاصل کر لی گئی ہیں جن پر غور و خوض کرنے کے لیے جلد ہی ماہرین کی نگرانی میں کمیٹی قائم کی جائے گی۔ واضح رہے کہ جھارکھنڈ کے اردو داں عوام ایک عرصے سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اردو کے فروغ کے لیے جھارکھنڈ میں بھی اردو اکادمی قائم کی جائے۔ سابقہ حکومتوں نے اس مطالبے پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی، مگر صدر راج کے نفاذ کے بعد گورنر نے اس مطالبے کو اپنی اولین ترجیحات میں شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر سید احمد نے کہا کہ صدر راج کے نفاذ کے بعد جھارکھنڈ میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کی ترقی کے لیے اقدام کیے جائیں گے جن میں اردو اکادمی کے علاوہ حج ہاؤس کی تعمیر بھی شامل ہے۔ گورنر سے جب اقلیتوں کے تعلیمی، سماجی اور دیگر حالات کے متعلق سچر کمیٹی کی سفارشوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ جھارکھنڈ میں سچر کمیٹی کی سفارشوں کو عمل میں لانے کے لیے احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔ انھوں نے اقلیتوں کی فلاح کے لیے بنائے گئے پانچ نکاتی وزیر اعظم پروگرام کے متعلق کہا کہ اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے اور خود گورنر کا دفتر اس کے نفاذ کی نگرانی کر رہا ہے۔

(آزاد ہند۔ کلکتہ)

## چکلیہ جونیئر گرلس ہائی اسکول میں
## اردو میڈیم طالبات کے داخلے کے لیے ایس آئی کو میمورنڈم

چکلیہ (۱۴ مارچ)۔ چکلیہ جونیئر گرلس ہائی اسکول میں اردو میڈیم طالبات کا داخلہ شروع کرنے کے لیے چکلیہ سرکل کے اسکول انسپکٹر کو آل انڈیا Students Block (چکلیہ شاخ) کی طرف سے ممتاز عالم کی قیادت میں ایک میمورنڈم دیا گیا جس میں ایس آئی سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ چکلیہ جونیئر گرلس ہائی اسکول کے ابتدائی دنوں میں جب اس اسکول کا قیام عمل میں آیا تھا اس وقت اردو میڈیم طالبات کا داخلہ بلا کسی امتیاز اور روک ٹوک کے لیا جاتا تھا، واضح ہو کہ 150 اردو میڈیم بچیوں کا داخلہ لیا گیا لیکن ادھر پچھلے کچھ عرصے سے ایک سازش کے تحت اردو میڈیم استانیوں کی کمی اور عدم موجودگی کا بہانہ بنا کر ایک طرف پہلے تو اردو میڈیم داخلہ بند کیا گیا دوسری طرف متذکرہ 150 بچیاں جو اسکول مذکور میں پہلے سے داخلہ لے چکی تھیں انھیں ٹی سی لینے پر مجبور کیا گیا، لہٰذا چکلیہ جونیئر گرلس ہائی اسکول کے ہیڈ مسٹریس کو متعلقہ ایس آئی فوراً ہدایت نامہ جاری کر کے اردو میڈیم بچیوں کا داخلہ از سر نو شروع کرائیں۔ میمورنڈم قبول کرتے ہوئے متعلقہ ایس آئی موصوف نے متذکرہ Students Block کو یقین دلایا کہ بہت جلد چکلیہ جونیئر گرلس ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹریس کو اردو میڈیم بچیوں کے داخلے کو یقینی بنانے کے لیے ہدایت نامہ جاری کر دیا جائے گا۔ ایس آئی آفس ذرائع نے نمائندہ آزاد ہند کو اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ اسکول مذکور کے ہیڈ مسٹریس کو اردو میڈیم بچیوں کا داخلہ لینے کے لیے ہدایت نامہ روانہ کر دیا گیا ہے۔ اب اطراف کے اردو میڈیم بچیوں کے سرپرستوں کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اب اپنی بچیوں کا داخلہ جتنی جلد ہو سکے اسکول ہذا میں کروائیں ورنہ تمام محنت بیکار ہو جائے گی۔

(آزاد ہند۔ کلکتہ)

## حکومت کی اردو دشمنی سے طلبہ کی تعلیم متاثر

حیدرآباد (یکم اپریل)۔ حکومت کی جانب سے اردو اساتذہ کی مختلف اسامیوں کو ایس سی / ایس ٹی طبقے کے امیدواروں کے لیے محفوظ کر دینے کے نتیجے میں اردو کے امیدواروں سے صریحاً ناانصافی کی جا رہی ہے اور یہ ناانصافی گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان اسامیوں کو عام زمرے میں شامل نہیں کیا جا رہا ہے جس کے باعث اساتذہ کی گزشتہ کئی برسوں سے اسامیاں خالی ہیں جس کے نتیجے میں طلبہ کی تعلیم متاثر ہو رہی ہے۔ ڈی ایس سی ۲۰۱۲ء میں اردو اساتذہ کی 1325 اسامیوں کا اعلامیہ جاری ہوا جس میں صرف 753 اسامیوں پر تقررات عمل میں لائے گئے، باقی اسامیوں کو محفوظ زمرے میں شامل کر دیا گیا۔ محفوظ زمرے کے اہل امیدوار نہ ملنے کی وجہ سے 572 اسامیاں خالی رہ گئیں۔ جناب اکبر الدین اویسی کی جانب سے اس وقت کے چیف منسٹر ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی سے نمائندگی پر حکومت نے ۲۰۰۸ء میں سرکاری حکم نامہ 74 جاری کرتے ہوئے اردو ٹیچرس کی اسامیوں کے لیے ایس سی، ایس ٹی، بی سی امیدوار اہل نہ ہونے پر ان اسامیوں کو غیر محفوظ قرار دیا تھا جس کے مطابق ۲۰۰۶ء ڈی ایس سی کے باقی بچنے والی ایس سی، ایس ٹی، بی سی اور خواتین کی اسامیوں کو غیر محفوظ قرار دیتے ہوئے ان اسامیوں پر بی سی اور او سی امیدواروں کو موقع فراہم کیا گیا۔ فی الوقت ڈی ایس سی ۲۰۱۲ء کی باقی ماندہ اسامیوں پر تقررات کے لیے ان اسامیوں کو غیر محفوظ قرار دینے کی امیدوار درخواست کر رہے ہیں۔ فی الوقت چتور میں 48، کڑپہ میں 68، اننت پور میں 50، کرنول میں 32، محبوب نگر میں 67، کھمم میں 3، حیدرآباد میں 124، نظام آباد میں 31، رنگا ریڈی میں 10، کریم نگر میں 8، میدک میں 54، نیلور میں 8، مغربی گوداوری میں 10، سریکاکلم میں ایک، وشاکھا پٹنم میں 7، وجے نگر میں 2، عادل آباد میں 15 اور ضلع کرشنا میں اساتذہ کی 14 اسامیاں خالی ہیں۔

(اعتماد۔حیدرآباد)

## اردو مدارس میں بنیادی سہولتوں کی کمی اور اساتذہ کی اسامیوں کے خالی ہونے کی شکایت

حیدرآباد (۲۳ مارچ)۔ آندھرا پردیش قانون ساز کونسل میں مجلس اتحاد المسلمین نے اردو زبان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ مجلس کے رکن سید الطاف حیدر رضوی نے وقفۂ سوالات میں مسئلہ اٹھاتے ہوئے سرکاری محکموں میں اردو زبان کو نظر انداز کرنے، اردو اساتذہ کی اسامیوں کو پُر نہ کرنے اور اردو زبان کی 15 اضلاع میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے عمل آوری میں کی جانے والی لاپرواہی پر حکومت کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ ٹیچرس کوٹے سے منتخب ہونے والے اراکین کونسل نے ان کی تائید کی۔ حکومت کے جواب سے عدم مطمئن ہو کر مجلس کے رکن کے ساتھ دوسرے ارکان نے بھی زبردست احتجاج کیا جس کے بعد صدر نشین کونسل ڈاکٹر چکرا پانی نے ایوان کی کارروائی کو چائے کے وقفے کے لیے ملتوی کر دیا۔ قبل ازیں جناب سید الطاف حیدر رضوی نے کہا کہ قانون ساز کونسل میں بھی اردو کا مترجم نہیں ہے۔ سوال چیف منسٹر سے کیا گیا تھا لیکن ریاستی وزیر گنٹی نارائنا نے اردو زبان سے متعلق پوچھے گئے سوال کا تلگو میں جواب دیا۔ مجلسی رکن نے کہا کہ اردو مدارس میں بنیادی سہولتوں کی کمی ہے، ٹیچرس کی اسامیاں خالی ہیں، ان کی جماعت نے غیر محفوظ زمرے میں ٹیچرس کی اسامیوں کو پُر کرنے کی بارہا چیف منسٹر سے نمائندگی کی اس کے باوجود حکومت نے اردو ٹیچرس کا تقرر نہیں کیا ہے۔ اردو مدارس میں معقول سہولت نہ ہونے کی وجہ سے ترکِ تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اسکول بند ہو رہے ہیں۔ جناب سید الطاف حیدر رضوی نے کہا کہ وزیر موصوف نے جواب میں کہا ہے کہ ہر ضلع کلکٹریٹ میں ایک سینئر اسسٹنٹ اور اردو کا مترجم مقرر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے کتنے اضلاع ہیں، حکومت اس کی وضاحت کرے۔ انھوں نے کہا کہ قانون حق معلومات کے تحت اردو میں درخواست کیوں قبول نہیں کی جا رہی ہے۔ مجلسی رکن نے کہا کہ سرکاری دفاتر میں اردو کے بورڈز آویزاں نہیں کیے گئے ہیں اور اردو زبان میں درخواستیں قبول نہیں کی جا رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت تلگو زبان کو فروغ دینے کے لیے کئی اقدامات کر رہی ہے لیکن اردو زبان کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے۔ اس مسئلے پر کانگریس کے رکن جناب فاروق حسین تلگو میں تقریر کر رہے تھے تو مجلسی رکن نے مداخلت کرتے ہوئے کانگریسی رکن سے کہا کہ کم از کم آپ اردو میں بات کریں۔ اس پر ریاستی وزیر دانم ناگیندر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت اقلیتوں کی ترقی کے لیے سنجیدہ ہے اور چیف منسٹر نے بجٹ میں اضافہ کیا ہے۔ سید الطاف حیدر رضوی نے کہا کہ وہ اردو زبان اور سہ لسانی فارمولے پر عمل آوری کی بات کر رہے ہیں۔ بجٹ پر مباحث کے وقت بجٹ کی بات کریں گے۔

(اعتماد۔حیدرآباد)

## اک دیا اور بجھا

حیدرآباد۔ ممتاز شاعر کامریڈ مخدوم محی الدین کے بڑے فرزند نصرت محی الدین کا ۱۵ اپریل ۲۰۱۳ء کی شام اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم نصرت محی الدین کا سرزمین دکن کے محبانِ اردو میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے وابستگی کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر میں اردو زبان کی ترقی، فروغ اور تحفظ کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں۔

ادارہ ہماری زبان مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

## کاروانِ ادب کی تقریب رسم اجرا، اعزازی جلسہ اور کل ہند مشاعرہ

ناگپور (ڈاک سے)۔ علم و ادب کے میدان میں سرگرم رہنے والی تنظیم 'کاروانِ ادب ملٹی پرپز سوسائٹی، ناگپور' نے ۱۹ مارچ ۲۰۱۳ء کو جج ٹریننگ سینٹر ہال، مومن پورہ، ناگپور میں جناب ظفر ناگپوری کی صدارت میں ایک سہ رنگی ادبی تقریب: رسم اجرا، اعزازی جلسہ اور کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا، جس میں شہر کے معروف شاعر شبیر ودروہی کے مجموعۂ کلام 'حرفِ صداقت' کا اجرا ممتاز شاعر جناب منور رانا کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ معروف محقق اور شاعر ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنے مقالے میں ودروہی کی شاعری پر جامع روشنی ڈالی۔ نظامت کے فرائض اشتیاق کامل نے انجام دیے۔ تقریب کے دوسرے اہم حصے 'اعزازی جلسہ' میں شہر کی جن لائق ستائش شخصیات کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تدریسی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'مولانا ناطق ایوارڈ ۲۰۱۳ء' سے نوازتے ہوئے مومنٹو، سپاس نامہ، شال اور گلدستے پیش کیے گئے، ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: ظفر کلیم، ظفر ناگپوری، یونس انیس، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر بدر جمیل، محمد غلام رسول اشرف، ڈاکٹر کلیم ضیا یزدانی، ڈاکٹر خالد نثار اور ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی۔

بعد ازاں کل ہند مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں صدر مشاعرہ ظفر ناگپوری، جناب منور رانا، جناب حبیب ہاشمی، شکیل اعظمی، حیدر بیگی، ملک راج پارس، مائل پالدھوی، مجاہد مالیگانوی اور ارم انصاری کے علاوہ مقامی شعرا: ظفر کلیم، محفوظ اثر، شبیر ودروہی، نظیر نشتب، محترمہ شبنم خان شبنم، اشتیاق کامل، نسیم ناگپوری، جمیل ارشد، نیاز احمد نیاز اور عمران فیضی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض جناب حیدر بیگی (ممبئی) اور جناب مائل پالدھوی (سورت) نے مل کر انجام دیے۔

### بزم اردو جودھپور کے زیر اہتمام

## واحد شاعر پروگرام

جودھپور (۳۰ مارچ، پریس ریلیز)۔ "نند کشور آچاریہ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی عمر سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ میں ان کی نظمیں سنتے وقت انھیں لکھتا رہا ہوں۔ ان کی نظم میں صرف فلسفہ ہی نہیں ہے بلکہ ان کی نظموں میں فلسفے کی گہرائی بھی موجود ہے۔" ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے سرکار اور بزم اردو جودھپور کے زیر اہتمام ہندی کے مشہور کوی نند کشور آچاریہ کے واحد شاعر پروگرام میں کیا۔ آچاریہ نے اپنے تازہ شعری مجموعہ 'کیول ایک پتّی' اور 'اتی شکلوں میں' سے 'سنگت'، 'بارش ہوتی ہے'، 'کسی دن'، 'راستے کے سپنوں میں'، 'زہنوں کا پھر بھی'، 'تکمیل' وغیرہ عنوان سے نظمیں سنا کر پروگرام کو یادگار بنا دیا۔ انھوں نے غالب کے اشعار کے حوالے سے بھی منتخب نظمیں پیش کیں۔ پروگرام میں ہندی، اردو اور راجستھانی زبانوں کے شاعر اور ادیب موجود تھے۔ ڈاکٹر شاہد راہی نے استقبال کیا اور پروفیسر کوشل ناتھ اپادھیائے نے شکریہ ادا کیا۔

## نظام آباد کے اردو مدارس میں اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ

حیدرآباد (۲۸ مارچ)۔ ضلع نظام آباد میں راجیو ودیا مشن کے سرکلر کے مطابق تعلیمی سال ۱۳-۲۰۱۲ء کے دوران قانون حق تعلیم کے تحت تقریباً 24 نئے اردو مدارس کا قیام جولائی ۲۰۱۲ء میں عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ پانچ اردو میڈیم پرائمری مدارس کو اپر پرائمری میں اپ گریڈ کیا گیا۔ کلکٹر نظام آباد کی ہدایت پر فروری ۲۰۱۲ء میں تین تلگو میڈیم مدارس میں اردو کی متوازی جماعتیں قائم کی گئیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی سال ۱۱-۲۰۱۰ء اور ۱۲-۲۰۱۱ء کے دوران آٹھ نئے اردو پرائمری مدارس کا قیام اور تقریباً 25 تلگو مدارس میں اردو کی متوازی جماعتیں قائم کی گئیں اور تقریباً 17 پرائمری مدارس کو اپر پرائمری میں اپ گریڈ کیا گیا۔ اس طرح جملہ 187 اردو مدارس کا قیام عمل میں آیا، جہاں پر طلبہ کی حوصلہ افزا تعداد بھی ہے لیکن آج تک ایک بھی اردو ٹیچر کا تقرر نہیں کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کی خصوصی دل چسپی کے ذریعے ان مدارس پر ودیا والینٹرس کا تقرر عمل میں آیا۔ تاہم اردو زبان کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جا رہا ہے، جب کہ قانون حق تعلیم کے تحت ہر 30 طلبہ کی تعداد پر ایک ٹیچر کا ہونا ضروری ہے۔ ۲۳ فروری ۲۰۱۳ء کو جی او نمبر 43 جاری کیا گیا جس میں آر وی ایم کی جانب سے قانون حق تعلیم کے تحت 10,917 اسامیاں منظور کی گئیں۔ ان تمام تفصیلات کو سید نعیم الدین صدر اپٹا ضلع نظام آباد نے کافی جستجو کے ساتھ حاصل کیں۔ ان تفصیلات کے ساتھ آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس ایسوسی ایشن سے پروفیسر انور خان کنوینر لیگل کمیٹی اپٹا کی قیادت میں میر ممتاز علی سکریٹری، محمد واحد علی سٹی سکریٹری نے کمشنر و ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن اوشا رانی سے ملاقات کرتے ہوئے ان تفصیلات کو پیش کیا۔ اوشا رانی نے وفد کو یقین دہانی کروائی کہ جلد از جلد اساتذہ کی تقرری کی جائے گی۔ اس موقعے پر سکریٹری اپٹا اے پی نے ریاست کے تمام اضلاع کے ذمہ داروں اور سماجی و سیاسی ذمہ داروں سے خواہش کی ہے کہ ہر ضلع کی اس طرح تفصیلات کے ساتھ متعلقہ ڈی ای او سے نمائندگی کرتے ہوئے کمشنر و ڈائرکٹر کو واقف کرواتے ہوئے جلد از جلد اردو میڈیم مدارس میں اساتذہ کی اسامیوں کی منظوری اور خالی اسامیوں پر تقرری کے لیے بھرپور توجہ دلائیں۔

(منصف۔حیدرآباد)

# نئی کتابیں

**تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے**

نام کتاب : میرا ناٹکی سفر
(خود نوشت)
مصنف : ڈاکٹر چرن داس سدھو
صفحات : ۸۳ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتا : کتابی دنیا، 1955، گلی نواب مرزا، محلہ قبرستان ترکمان گیٹ، دہلی ۶
تبصرہ نگار : دیپک بدکی

اپنی زندگی کے لیے نصب العین مقرر کرنا اور پھر حسبِ منشا کوشش کر کے اپنی منزلِ مقصود حاصل کرنا موجودہ دور میں محض خواب دکھائی دیتا ہے۔ تاہم کبھی کبھار ڈاکٹر چرن داس سدھو جیسی شخصیات اس خواب کو سچ کر دکھاتی ہیں۔ موصوف کی زندگی کی کہانی انھی کی زبانی 'میرا ناٹکی سفر' میں رقم کی گئی ہے۔

ڈاکٹر سدھو ۱۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو بھام، ضلع ہوشیار پور، پنجاب میں ایک دلت خاندان میں پیدا ہوئے، نویں جماعت میں پہلی نظم لکھی۔ دہلی یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا اور پھر میڈیسن، وسکانسن امریکہ سے ایم اے، پی ایچ ڈی کی ڈگری (موضوع: دی پیٹرن آف ٹریجی کامیڈی ان برنارڈ شا) لے کر واپس اپنے ملک آگئے۔ بچپن ہی سے نقل، راس، رام لیلا، کرشن لیلا، راگیوں اور کتھا واچکوں میں دل چسپی لیتے رہے، البتہ سوچ و فکر سے مارکس وادی، حقیقت پسند اور ناستک رہے۔ آئی اے ایس کے امتحان میں دسواں مقام حاصل کرنے کے باوجود انھوں نے دہلی کے ہنس راج کالج میں انگریزی پڑھانے کو ترجیح دی اور اپنی زندگی غریبوں میں بیداری لانے اور ان کو توہم پرستی سے نجات دلانے کے لیے وقف کی۔ ڈاکٹر سدھو کا پہلا اور آخری پیار 'ناٹک' ہے اس لیے انھوں نے کالجیٹ ڈرامہ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ڈرامہ نگاری کی نشو و نما کے لیے عمر بھر کام کرتے رہے۔ انھوں نے اس فن کی خاطر اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کیا اور بقول ڈاکٹر سدھو "ڈرامے بازی میں اپنے ساتھ اپنے پریوار کو، اڑوس پڑوس کو، یاروں دوستوں کو بھی گھسیٹتا چلا گیا"۔ ڈرامے پر ریسرچ کرنے، انگریزی مضمون پڑھانے، دنیا کی کئی زبانوں کے ڈراموں خاص کر یونانی اور سنسکرت ڈراموں کے مطالعے اور اپنی دھرتی کی قدیم پرمپراؤں کے مشاہدے سے ان کے علم میں گیرائی اور گہرائی دونوں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے انگریزی، اردو، پنجابی اور ہندی میں 36 ڈرامے تحریر کیے ہیں، 70 ڈراموں کے ساتھ بطور ڈیکٹر، تکنک یا ڈائرکٹر وابستہ رہے ہیں اور اس کے علاوہ درسی و تنقیدی کتابیں بھی رقم کی ہیں۔ 'کالجیٹ' نے 4 ڈرامہ نگار، 8 ہدایت کار اور کوئی 1300 ایکٹر پیدا کیے ہیں جب کہ تقریباً 600 بچوں کو رنگ منچ سے جوڑا ہے۔

ڈاکٹر سدھو کا ماننا ہے کہ "الفاظ سے پیارہ شبد ہو، مصنف بننے کے واسطے پہلی سیڑھی ہے"۔ ناٹک کی بناوٹ کے لیے وہ پلاٹ، کردار، مکالمہ، پس منظر، تکنیک اور زندگی کے فلسفے کو اہم مانتے ہیں۔ اسی طرح وہ ناٹک ٹولی کی کامیابی کے لیے لوک راج، صلاح مشورہ، سرمایہ اور جنسی استحصال سے گریز کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مذکورہ خود نوشت ہر اس قاری کے لیے ضروری ہے جو زندگی میں اونچی اڑان بھرنے کے سپنے دیکھتا ہو۔ خاص طور پر ڈرامے کے طالب علم کے لیے یہ مشعلِ راہ کا کام کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر چرن داس سدھو کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ اردو ادب کے لیے یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے اور مجھے امید ہے کہ اس تصنیف کی خوب پذیرائی ہوگی۔

■◆■

نام کتاب : کندن پارے
مصنف : کندن لال کندن
صفحات : ۱۵۲ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی 110006
تبصرہ نگار : ڈاکٹر حقانی

'کندن پارے' (۲۰۱۲ء) اہم و قیمتی مجموعۂ کلام ہے اس لیے کہ یہ شعراء کو شاعری کے ساتھ ساتھ فنِ عروض پر بھی راغب کرتا ہے، جس میں یہ رنگِ تغزل روایتی شاعری کو زندہ رکھتے ہوئے قواعد و ضوابطِ عروض کے مخصوص نکات کو عام کر کے فنِ عروض کو دل چسپ جہت عطا کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ ہر کلام کے نیچے بحر و وزن کا اندراج ہے۔ کندن لال کندن کی یہ کارکردگی سوز و ساز کی منادی معلوم ہوتی ہے جس کا اندرون تقطیل، بحر و وزن میں آسانی پیدا کرتا ہے، جس کے لیے ایک بحر و وزن کو متعدد بحور و اوزان میں ڈھکر دکھایا ہے کہ مشق میں پختگی آجائے۔

کتاب میں پروفیسر عراق رضا زیدی کا مضمون بہت عمدہ ہے، عروضی فارم میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور چند منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ صرف یہ فرما کر کہ "ان میں مقصدیت اور کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہے" تشریح فرماتے تو اچھا تھا، جیسے کامل آخریدی صاحب نے اپنے مضمون میں منتخب اشعار کی تشریح بھی اپنے خوب صورت اور عالمانہ انداز میں فرمائی ہے۔

آیئے 'کندن پارے' پر مزید کچھ سرسری نظر ڈالتے چلیں! کندن صاحب کا وطن تو نسہ شریف یعنی صوفیا اور صوفیوں کے مسکن سے منسوب ہے، اس لحاظ سے بھی شاعری میں تخیل اور وجدان کا زیادہ غلبہ ہونا چاہیے تھا مگر آپ عروضی کمالات کی نمائش میں مصروف ہو کر رہ گئے اور شعرا کی عروضی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ یہ بات اپنی جگہ سند روایات کی پاس داری کی دلیل ضرور ہے، مگر مجموعۂ کلام کو شاعری کی معنی خیزی سے منسوب نہ کرتے ہوئے عروضی نقطۂ نظر کی غزلیات سے منسوب کیا ہے۔ مانا یہ معاملہ فن کاری کی ترجیحی قدر کا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ مجموعۂ غزلیات ہے، اس لیے غزل کی جادوگری اور معنی خیزی سے عاری نہیں ہو سکتا۔

چوں کہ عروضی فن کاری کے علاوہ کندن صاحب کے کلام میں حسنِ زبان بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، سادگی، روانی، چستی، بندش و ترتیبِ الفاظ، فصاحت، بلند آہنگی جیسے امتیازات کلام میں جا بجا جلوہ گر ہیں جو نادرالکلامی اور کہنہ مشقی کا ثبوت ہیں۔ صنعتوں کی جلوہ گری بھی پُر لطف ہے۔ موضوعات کی طرف متوجہ ہوں تو تصوف، حب الوطنی، انسان دوستی جیسی اعلا اقدار کے علاوہ زندگی کی عطا کی ہوئی بے چینیاں اور حسن و عشق کے متعلقات کی جلوہ گری بھی دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ تصوف کی گہرائی بھی قابلِ دید ہے۔ فرماتے ہیں:

> تو بے نقش کل کش ہو جاؤ میں تم ہوا
> خلق رب ہے جو حسینوں کے ناز میں تم ہوا

تصوف کا ایک عقیدہ 'ہمہ اوست' کا ترجمان شعر ہے۔ جو کچھ ہے ذاتِ اعلا ہے، وہی حقیقتِ کل ہے، باقی سب سرابی فسانہ ہے۔ کائنات تک ذاتِ باری کی مظہر ہے۔ ویدانت کا یہ فلسفیانہ سوچ شعرا کو بڑا مرغوب رہا ہے۔ کندن کیسے مستثنیٰ رہتے؟ شعر ہے:

> حجاب راز میں چھپنے نہ دے گا یہ کندن
> کرو گے منتر پا آکے جو جھاڑ میں تم ہوا

استغنا کی صفتِ اعلا کا اظہار ہے کہ بندے کو ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا چاہیے۔ شانِ محبوبی یہ کہ 'کوئی گلہ نہ کیا جائے'۔ اس کو کیا خوب فصیح انداز میں ظاہر کیا ہے:

> تیرا گلہ کس لیے تیرا گلہ کیوں کروں؟
> وقت پہ سب کچھ دیا مرحبا کیا کیا!

'روزِ الست' کی تلمیح کو موجودہ صورتِ حال سے منسلک کرکے وقت کے فاصلے کو ختم کر دینا اچھی شاعری کا کمال ہو سکتا ہے:

> عہد کیا تھا بھی تیرے ہی کن گاؤں گا!
> شرم و حیا بیچ کے خوب تماشا کیا!!

> آسماں نامہرباں دیکھیے کب تک رہے
> ہائے یہ آتش فشاں دیکھیے کب تک رہے

کب تک رہے میں حالات کو بدلنے کی بات بڑے دلکش انداز میں کی ہے۔ آسمان کو ہماری روایت میں مصائب اتارنے کا ذریعہ مانا گیا ہے۔ آسمان ظالم ہے۔ تقدیر سب کھیل کرتی ہے مگر آسمان نامہرباں کیوں ہے؟ انسان کا فرض ہے کہ وہ ناراضی کا سبب معلوم کرنے کے لیے خود احتسابی کرے یہ زیریں لہریں شعر کو معنی خیز بنا گئی ہیں۔ نامہربانی کے سبب دنیا آتش فشاں بن گئی ہے۔ اس سیاست کو سمجھنا انسان کے لیے لازم ہے:

> آندھیاں طوفان ہیں ہر گھڑی کٹھن جہاں
> میرا نازک آشیاں دیکھیے کب تک رہے

نہ صرف عصری کرب بلکہ آفاقی صورتِ حال کو محیط کیے ہوئے ہے۔ یہ گلوبل صورتِ حال ہے جو دہشت گردی، ظلم اور ایٹمی جنگوں کی صورت میں ہے۔ ہر شخص جو فرد کا گھر ہو یا ملک و وطن ہو پورا کرۂ ارض خطرے میں ہے۔ اپنی ذات کو نشانۂ ستم بنا کے پوری دنیا کے درد و کرب کا اظہار بلیغ کاری ہے۔

> بوجھتا ہے جو ہر لیں سب کچھ نہ سکتا ہوں میں
> ہاتھ میں یہ جامِ جم دیکھیے کب تک رہے!!

جامِ جم کی تلمیح کے وسیلے سے شاعر نے اپنے عارفانہ وصف اور علم و آگہی کا اظہار بڑے دلکش پیرایۂ بیان میں کیا ہے، خوب شعر ہے، جتنی داد دی جائے کم ہے:

> نہ کانٹے کی قیمت کو کم جانیے
> ہے کانٹا بھی اپنی جگہ کام کا
> تھا کانٹے سے بڑا حسین کانٹے کا کام

لیا ہے:

> نہیں ہے چیز کبھی کوئی زمانے میں
> کا یہ ہنکا سی انجام دلکش ہے

> ہے تصویر حاضر ملاقات کرلو
> کر پیشِ نظر اس سے ہر بات کرلو!

اسلوبِ بیان اور طرزِ فکر و احساسات کے اعتبار سے رنگِ جمال مجازی بھی ہے اور صوفیانہ بھی۔ کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لے کر پڑھیے اور لطف اٹھایئے!

■◆■

## بقیہ: اندازِ بیاں اور!

صفحہ ۸ سے آگے

لیکن انھوں نے غالب کے معاملے پر اس کا اطلاق جس شدت سے کیا ہے، اتنی شدت شاید خود قانونِ شہادت کا متقاضی بھی"۔ (ص ۳۵)

فاروقی نے اپنی تصنیف 'اثبات و نفی' میں محمد علی جوہر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا موازنہ مولانا ظفر علی خاں سے کیا ہے۔ دونوں سیاست داں تھے اور اپنے خیالات کی ترجمانی اشعار کے ذریعے بھی کی ہے۔ فاروقی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ محمد علی جوہر غزل کی رسومات سے واقف تھے، لیکن جب بھی ان سے چوک ہوئی وہ غزل کی اُس خاص ڈگر سے ہٹ گئے:

"محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں میں یہی فرق ہے کہ محمد علی کی بہترین شاعری ان رسوم کے اندر ہے جو اس وقت غزل کے لیے مقرر تھے۔ جہاں وہ دائروں سے باہر نکلے وہ عمومی سطحیت اور فقرہ بازی اور نثریت کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً یہ شعر دیکھیے جو بظاہر غزل کے رسوم کے اندر ہے:

> تجھے ہے قرب بادہ پر غرہ، حسن پر ہم کو
> ناشتہ وزد سا مادری قدرت کہاں تک ہے

لیکن غزل کے مزاج شناس جانتے

ہیں کہ شعری اساس 'قوتِ بازو' پر ہے، جو معشوق کی رومانی صفت نہیں ہے۔ معشوق خون خرابہ کرتا ہے لیکن 'زورِ بازوئے قاتل' کی بات بھی ہوتی ہے تو حسن کے حوالے سے، پہلوان کے طور پر نہیں''۔ (ص ۱۱۴)

فاروقی نے جاں نثار اختر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے سیاسی نظریے اور اپنے سیاسی نقطۂ نظر کا انکشاف کیا ہے۔ انھوں نے بائیں بازو والوں کی ناراضگی کا اظہار بڑے پُرلطف انداز میں کیا ہے 'جاں نثار اختر کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ذاتی طور پر وہ مارکسی ہیں۔'' اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ سیاست کی سطح پر میرے کیا عقائد ہیں تو میں بلا تکلف دائیں پر بائیں کو ترجیح دوں گا۔ میں خود کو برٹرنڈ رسل کی طرح لبرل سمجھتا ہوں۔ (یہ اور بات ہے کہ بائیں سیاسی نقطۂ نظر والے برٹرنڈ رسل کے نام سے بھی اس طرح بدکیں گے، جس طرح سارتر پر لاحول بھیجتے ہیں)''۔ (ص ۱۴۰)

ناصر کاظمی کے کلام پر بھی مختلف شعرا کے اثرات اور اس ضمن میں نقادوں کے بیان کا تجزیہ فاروقی نے ہمیشہ کی طرح منفرد انداز میں کیا ہے۔ موضوع سنجیدگی کا متقاضی ہے، لیکن انھوں نے ایک کٹر نقاد کی طرح پر نہیں بلکہ ایک مزاح نگار کی حیثیت سے بڑے دل چسپ پیرائے میں اس روداد کو بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی بطور خاص ملحوظ رکھا ہے کہ جس شاعر کے بارے میں اظہار خیال کیا، اس کی شخصیت کی تصویر کشی میں من وعن اُس کی ذات کا پرتو محسوس ہو:

''سودا کی لفظی شوکت، ٹھاٹ یا ناسخ کی بے روح مگر بال کی کھال نکالنے والی 'نازک خیالی' مومن کی سطحی پیچیدگی، یگانہ کی زوردار مگر شعری تخلیقیت سے عاری اکڑفوں، ان سب کے مقابلے میں میر کی عاشقانہ شاعری، اگر سطحی نظر سے دیکھی جائے تو وہ یقیناً 'نری تڑپ' چبھن، ارتعاش، کلاوات، برجستگی، برہنگی وغیرہ قسم کی مہمل اور غیر تنقیدی اچھائیوں سے مملو نظر آئے گی۔ اور چوں کہ ناصر کاظمی کا کلام (چاہے وہ 'برگ نے' کے دور کا میٹھا میٹھا رومانی طرز کا ہو یا بعد کے صلابت آمیز اسلوب کا) سودا، مومن، ناسخ، غالب، یگانہ وغیرہ کے کلام سے مماثلت نہیں رکھتا، لہٰذا اسے میر سے مماثل کہنا چاہیے۔ اس قسم کی تنقیدی ٹامک ٹوئیاں نے ناصر کاظمی کو نقصان زیادہ پہنچایا، فائدہ کم، وہ خود میر کو پسند کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میر کے تتبع یا نقال کہے جاتے۔ لیکن ان کی میر پسندی، اس وجہ مشہور کر دی گئی کہ انھیں بھی یقین آگیا کہ وہ پیرو میر بلکہ کسی طرز میر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بالغ ہونے میں دیر لگی، بلکہ وہ آخر عمر تک بالغ نہ ہونے پائے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی کا اسلوب انتہائی انچھوا اسلوب تھا۔ اگر اس پر میر کا پرتو ہے تو غالب کا بھی انعکاس ہے۔ میر اور غالب اور ان کے واسطے سے فانی کی جھلک ان کے کلام میں نظر آتی ہے لیکن یہ محض جھلک ہے اس سے زیادہ نہیں۔ مجموعی طور پر اپنے بہترین لمحات میں ناصر کاظمی ہماری غزل کے گنے چنے Original شاعروں میں سے ایک ہیں۔ میر اور فراق کے جوڑ نے ان کی شاعری پر اس بے دردی سے لگائے گئے کہ ان کا اپنا رنگ پہچان ہی میں نہ آسکا''۔ (ص ۱۳۷)

مذکورہ بالا اقتباس زیادہ طویل ہو گیا، لیکن اس میں کمی بیشی کی جاتی تو قاری اصل لطف سے قاصر رہتا۔ دوسرا یہ کہ فاروقی نے ناصر کاظمی کو ایک اچھا شاعر مانتے ہوئے، ایک ہلکی سی چٹکی لے کر انھیں اس بات کا احساس دلایا کہ دوسروں کی باتوں پر ایمان لاکر اپنی حقیقت سے ناآشنا رہے۔

'برگ نے کے بعد' میں فاروقی نے ناصر کاظمی کے شعر کا موازنہ کسی اور کے شعر سے کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موضوع ایک ہی ہے، لیکن 'برگ نے' کے شاعر نے نہایت خوب صورتی سے جذبات کی جو عکاسی کی ہے وہ بات دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ہے۔ فاروقی کے تاثرات پیش ہیں:

اس طرح ہوتی رہی تکمیل جذبات وفا
ہم ادھر ملتے رہے اور وہ ادھر ملتے رہے

... کے ساتھ ناصر کاظمی کا یہ شعر دیکھیے۔ اگر اب بھی دلیل و تجزیہ ضروری ہو تو تنقید واقعی کار بیکاراں ہے:

میں تو آج بہت رویا ہوں
تو بھی شاید رویا ہوگا

لیکن پھر بھی اتمام حجت کے لیے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم ادھر روتے رہے... والے شعر کا پہلا مصرع بالکل بے کار ہے اور تکمیل جذبات وفا کے ادھر اُدھر کے تذکرے باقاعدہ باجماعت اور جزئیت امام کی وہ میری والی صورت پیدا کر دی ہے''۔ (ص ۱۳۲)

'برگ نے' کے جن اشعار کو دیگر ناقدین نے جذباتیت کی اچھی مثالیں قرار دیا تھا، ان کے بارے میں فاروقی کے دل چسپ تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

''اگر 'برگ نے' میں سپاٹ جذباتیت والے شعر نمایاں ہیں (جذباتیت سے مراد یہ ہے کہ جذبہ معمولی یا کم پیچیدہ ہو لیکن الفاظ اس کے لیے ایسے استعمال ہوں جو ضرورت سے زیادہ ہوں۔ گویا مچھر مارنے کے لیے پچاس من کا ہتھوڑا استعمال کیا جائے۔ کلی انتھ بروکس نے اس موضوع پر اچھی بحث کی ہے۔ کاش ہمارے نام نہاد نرم لہجہ اور جذبے کی تھرتھراہٹ سے بھرپور پوپلی شاعری کرنے والے شعرا نے اس بحث کا مطالعہ کیا ہوتا)''۔ (ص ۱۵۷-۱۵۶)

فاروقی نے اپنی تصنیف 'اردو کا ابتدائی زمانہ' میں دورِ حاضر میں اردو زبان سے جو تعصب برتا جا رہا ہے، پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندی کے فروغ کی مساعی کا ذکر کیا ہے، حالاں کہ یہ بہت ہی سنجیدہ اور گمبھیر مسئلہ ہے، لیکن انھوں نے اپنے جذبات پر قابو اور اپنی تہذیبی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو بھرپور طنز کیا ہے وہ قابل دید ہے:

''بھارتیندو کو جدید ہندی کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں وہ اردو چھوڑ کر ہندی کی طرف جا رہے تھے اور یہی نہیں کہ وہ اردو کو ترک کر رہے تھے، وہ 'اردو بیگم' کی موت کے بارے میں انتہائی جارحانہ بلکہ رکیک طنزیہ تحریریں بھی لکھ رہے تھے۔ 'اردو بیگم' کے ماتم داروں میں حسب ذیل زبانیں تھیں: عربی، فارسی، پشتو اور پنجابی، وجہ یہ تھی کہ ان چاروں کا رسم الخط غیر ملکی'۔

(باقی آئندہ)

# اندازِ بیاں اور!

ڈاکٹر لئیق صلاح
354-محمود باغ، آصف نگر
حیدر آباد-500028

طنز و مزاح کی تعریف، تنقید و تجزیے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن بعض موضوعات کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ جتنا بھی اس کو سمیٹنے کی کوشش کریں پھر کوئی نیا گوشہ سامنے آتا ہے۔ ابتدا تو طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات سے ہوئی، جس کا دائرہ بہت وسیع رہا۔ اس سے نثر نگار بھی جڑے اور شعرا بھی۔ پھر اس کو ایک تحریک کے طور پر یا ایک پیغام کی صورت میں دوسروں تک پہنچانے کی مساعی ہوئیں۔ اس کو عوام سے متعارف کروانے کے مختلف منصوبے بنے، تجویزیں ہوئیں تاکہ اس کی تشہیر زیادہ سے زیادہ ہو۔ طنزیہ و مزاحیہ تحریریں کتابوں کی صورت میں شائع ہوئیں علاوہ ازیں اس کی اشاعت کو مزید وسعت دینے کے لیے مختلف رسالے منظر عام پر آئے۔

طنز و مزاح ایک ایسا موضوع ہے جس کے لیے کسی خاص صنف کی تخصیص نہیں، نثر و نظم کی تقریباً تمام اصناف کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کہیں اس میں انشائیہ کی جھلک ہے تو کبھی اس کو افسانوی روپ میں دیکھا گیا۔ بعض اوقات افسانے کی منزل سے گزر کر ناول کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ ڈرامے کی صورت اختیار کرتا ہے تو بات اسی پر ختم نہیں ہوتی۔ طنز و مزاح کی سرپرستی کرنے والوں نے چاہا کہ اس کی مزید ترقی کے لیے کرداروں کو اسٹیج پر پیش کریں تاکہ اس کا رنگ اور نکھرے۔ کبھی مضمون یا کالم کی شکل میں سماجی اور سیاسی مسائل اور افسر شاہی کے خسروانہ رویے کو پیش کیا۔ سنجیدگی کی فضا سے قریب ہوا تو اہلِ نظر نے ان موضوعات پر سیمینار اور کانفرنس کا انعقاد کر کے اپنی بصیرت کا ثبوت دیا یا پھر زندہ دلی کے اظہار کی ضرورت پیش آئی تو لطائف کی محفلیں اور مشاعروں کا اہتمام کیا گیا۔ سفرنامے، سوانح حیات، خطوط الغرض اس کے جلوے، نگاہ کو خیرہ کرتے ہیں۔

طنز و مزاح کی تاریخ معتبر، مستحکم اور قدیم ہے۔ زندگی کی دوڑ دھوپ اور گمبھیر مسائل سے فرار حاصل کرنا ہو تو اسی کے دامنِ عفو میں پناہ ملتی ہے۔ واماندگیٔ شوق کی پناہ گاہ یہی ہے۔ آپ نے کئی لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ بہت بور ہو رہے تھے سوچا کہ ایک مزاحیہ فلم دیکھ آئیں۔

طنز و مزاح کی جان کاری سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ یہ 'کارِ شیشہ گری' ہے۔ ایک تو ہنسنا آسان ہے، ہنسانا مشکل؛ اور پھر ہنسانے کے ساتھ بہکنا نہیں ہے۔ مزاح نگار کو اس کی تخلیقات یا اس کی ظریفانہ تکنیک کی وجہ سے جو ممتاز و منفرد مقام عطا کیا جاتا ہے، ذرا سی لغزش اسے عرش سے فرش پر پٹخ دیتی ہے۔

عصرِ حاضر میں مزاح پر تحقیق اور تنقید کا ایک نیا باب وا ہوا ہے۔ قدیم ورثے کی چھان بین کی گئی تو دورِ قدیم، متوسط اور جدید کا سرمایہ دستیاب ہوا۔ جو لوگ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اُن کی سرشت میں بھی مزاح ہے۔ اس میں شک نہیں کہ منشی سجاد حسین، سرشار، اکبر الہ آبادی، مرزا فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن، رشید احمد صدیقی، یوسف ناظم، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین، عصمت چغتائی، شفیقہ فرحت، زینت ساجدہ، بانو سرتاج، پرویز یداللہ مہدی، رشید موسوی، حبیب ضیا، مسیح انجم اور جلیلہ فردوس وغیرہ کے یہاں تو اس کی کوئی پردہ پوشی نہیں۔ یہاں تو طنز و مزاح کے جلوے، دعوتِ نظارہ کھلے عام دے رہے ہیں، لیکن ثقہ لوگوں کی تحریروں میں بھی مزاحیہ عناصر تلاش کیے گئے، مثلاً نثر میں نذیر احمد، اُن کے علاوہ اور بھی شخصیتیں ہیں جنھوں نے اپنی پہچان ادب کی کسی اور صنف سے بنائی تھی، مگر جب ان کی تحریروں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا گیا تو اُن کے یہاں بھی مزاح کے اثرات نمایاں نظر آئے، مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور سر محمد اقبال وغیرہ۔

آج میں ایک ایسی ہی شخصیت کا ذکر یہاں کروں گی، جن کو لوگ نقاد، سوانح نگار، افسانہ و ناول نویس، شاعر، محقق، لغت نگار اور ایک موقر رسالے کے مدیر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میری مراد شمس الرحمٰن فاروقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جدیدیت کے علمبردار کی حیثیت سے اُن کی ایک خاص شناخت ہے لیکن اُن کی تحریروں میں طنز و مزاح کی جھلک بھی ہے۔ اُس خصوصیت کی طرف جہاں تک میرا علم ہے کسی نے توجہ نہیں کی، کیوں کہ ایک خاص معیار اور مقام متعین ہونے کے بعد ہم کسی دوسرے زاویے سے دیکھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے، یعنی کسی شخص کی پہلی پہچان دوسری خصوصیات کو غیر اہم بنا دیتی ہے۔ ایک عام تصور یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی مفکر یا دانشور سے ہم صرف سنجیدہ اور خشک تحریروں کی ہی توقع رکھتے ہیں۔ تنقید اور لسانیات جیسے نہایت سنجیدہ موضوعات میں بھلا کون سوچ سکتا ہے کہ وہاں مزاح سے لطف اندوز ہونے کی چھوٹ بھی دی جا سکتی ہے۔ اس طرح کے قوانین اور ضابطے بنانے کے باوجود لکھنے والے کے اندرون یا لاشعور میں جو جذبہ پنہاں رہتا ہے وہ اپنی نکاسی کے لیے راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ بعض اوقات سنجیدہ موضوع کی خشکی کو شگفتگی میں تبدیل کر کے تحریر کو موثر بنایا جاتا ہے۔ فاروقی صاحب سے ان کی تحریروں کے کچھ حوالے دیتے ہوئے جب یہ بات دریافت کی گئی تو انھوں نے نہایت انکساری سے کہا کہ میں مزاح نگار اصلاً تو نہیں لیکن تحریر کو دل چسپ بنانے کی خاطر کہیں بیان میں لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ذیل میں اُن کی مختلف تصانیف یعنی غالب پر چار تحریریں، اثبات و نفی، اردو کا ابتدائی زمانہ، اردو غزل کے اہم موڑ، اندازِ گفتگو کیا ہے اور شعرِ شور انگیز سے کچھ عبارتیں نمونتاً پیش کی جائیں گی جن سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے مزاح کتنا ضروری ہے۔

'غالب پر چار تحریریں' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ فاروقی 'یادگارِ غالب' کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے خامہ فرسا ہیں کہ حالی نے غالب کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی تھی، ان کا یہ رویہ خواہ بر بنائے مصلحت نہیں بلکہ بر بنائے محبت تھا، لیکن ردِعمل کے طور پر یگانہ نے جو کچھ برا بھلا کہا، بیان ان ہی کی زبانی سنیے:

''ان کی تحریر میں ذاتی تعصب اور احساسِ کمتری کا تیزاب زیادہ تھا، تنقید کا آبِ زلال کم''۔ (ص ۳۶)

غالب سے منسوب ایک ڈومنی کی حکایت بھی عام ہے، مگر فاروقی صاحب کے یہاں یہ قابلِ قبول نہیں۔ لکھتے ہیں: ''شیعہ ڈومنی یا طوائف کے وجود کے بارے میں شاید کیا، کسی قسم کی گپ بھی ہم تک نہیں پہنچی''۔ (ص ۳۴)

غالب کے تعلق سے جتنا برِ صغیر میں لکھا گیا ہے، اس سے ممکن ہے بعض بیرونی افراد نے زیادہ ہی لکھا ہو۔ ان میں غالب کی ایک سوانح نگار 'پری گارنا' ہے، جس نے روسی زبان میں سوانح مرتب کی تھی۔ اس کا ترجمہ اسامہ فاروقی نے اردو میں کیا، اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی درخواست شمس الرحمٰن فاروقی سے کی گئی تھی۔ پری گارنا کی تحقیق کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عام تصانیف کی طرح اس کا دیباچہ لکھنا آسان نہیں تھا کیوں کہ کئی پیچیدہ مسائل تھے جن کی گتھی سلجھانا ضروری تھا۔ ان مشکلات کا حال ملاحظہ فرمائیے: ''میرا ارادہ تھا کہ دیباچے کے نام پر دو تین صفحات لکھ کر فرض سے ادا ہو جاؤں لیکن پری گارنا کی کتاب میں اتنے مسائل اور اتنے پہلو سامنے آئے ہیں کہ خود میرے خیالات کو مہمیز لگی اور میں دیباچے کے نام پر دور دور گلی کوچوں میں بھٹکتا پھرا''۔ (ص ۳۶)

غالب کے فرضی استاد عبدالصمد کے وجود سے قاضی عبدالودود نے انکار کیا تھا۔ فاروقی صاحب نے قاضی صاحب کے بیان پر اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''قاضی صاحب مرحوم کا یہ اصول ہندستانی قانونِ شہادت (Indian Evidence Act) پر مبنی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں مطبوعہ: شر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org